# پاک ناموں والا پتھر

## ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر ضیاء الحسن

ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

# STONE BEARING SACRED NAMES

## AN ANALYTICAL STUDY

Zia ul Hasan, PhD

Associate Professor of Urdu

Department of Urdu, University of the Punjab, Lahore

**Abstract**

Stone bearing sacred names Pak Namuon Wala Pathar is very beautiful and interesting short story written by Nayyer Masood, a unique Urdu writer. The article presents analysis of the story based on a symbol Pak Namuon Wala Pathar. The stone is a family sign of the basic character. The sign symbolizes the human urge of eternity. Here the family becomes human society, thus the meaning flows from individual to collective human self. The article also analyzes the language which creates mystery of the story.

**Keywords:** نیر مسعود، پریم چند، بیری، منٹو، انتظار حسین، خالدہ حسین، گنجفہ، فن، افسانہ، عطر کافور

نیّر مسعود اسرار اور تحیّر سے افسانہ تخلیق کرتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ حسن اور کشش کے یہی بنیادی منبعے ہیں۔ جہاں اسرار اور تحیّر ختم ہو جاتے ہیں، وہاں حسن اور کشش بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ نیّر مسعود روزمرہ زندگی کو اپنے بیان کے ذریعے پُر اسرار بنانے کا فن جانتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں معمولی چیزیں اپنی پیشکش کی وجہ سے غیر معمولی نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ دراصل ان کے بیان کا سلیقہ ہے جو ڈیوڑھیوں، حجروں، قفلوں، گوداموں، لکڑی، شیشے اور دھات کی بنی ہوئی روزمرہ استعمال کی چیزوں، قدیم ریشمی لباسوں، لکڑی کے صندوقوں، کپڑوں کی کترنوں، دیواروں، دروازوں، دالانوں، کوٹھریوں اور بے کار چیزوں کو بہت خاص اور بہت غیر معمولی بنا دیتا ہے۔ اس میں کچھ دخل اس لفظیات کو بھی ہے جو ہمارے تجربے میں نہیں رہی اور جس کو پڑھتے ہوئے ایک خاص طرح کی قدامت کا احساس ہوتا ہے، جیسے وہ برآمدہ کہنے کی بجائے دالان کہہ دیں گے، کمرہ کہنے کی بجائے حجرہ، تالا کی بجائے قفل، چابی کی جگہ کنجی کہیں گے۔ یہ زبان صرف زبان نہیں ہے بلکہ اپنے اندر ایک مٹی ہوئی اور اجڑی ہوئی تہذیب کی بو باس لیے ہوئے ہے۔ اسی لیے ہمیں نیّر مسعود کے افسانوں میں پرانے مکانات، ویران حویلیاں، ناقابلِ استعمال چیزیں، بے ترتیب باغ، پلستر گرتی دیواریں، پرانے فیشن کے ملبوسات کا ذکر ملتا ہے۔ یہ عام عناصر بذاتہ کسی اجڑی ہوئی محفل اور گزرے ہوئے زمانے کی علامت بن جاتے ہیں۔ یہی نیّر مسعود کا فن ہے جو اس تحیّر کو پیدا کرتا ہے جو ہمیں مسحور کر دیتا ہے اور ہمیں افسانے کے معانی سے کچھ زیادہ سروکار نہیں رہتا۔ ہم اس فضا سے ہی وہ تخلیقی لطف حاصل کر لیتے ہیں جو خود ہی ایک مکمل معانی محسوس ہوتا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے واقعات اور بیانات میں چھپے ہوئے معانی سے زیادہ اہم وہ معانی ہیں جنھیں ان کے افسانوں کی فضا نے پیدا کیا ہے اور جنھیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن پورے طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے نیّر مسعود ایک مختلف افسانہ نگار رہیں کیوں کہ وہ ہمیں افسانہ پڑھنے کی ایک نئی تہذیب سے روشناس کراتے ہیں۔ ہم ان کو اس طرح نہیں پڑھ سکتے جس طرح ہم پریم چند، بیدی، منٹو، انتظار حسین یا خالدہ حسین کو پڑھتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا افسانہ کسی عیاں یا نہاں معنویت پر استوار ہے اور اس افسانے کے تخلیقی لطف کا دارومدار اس عیاں یا نہاں معنویت پر ہے جب کہ نیّر مسعود کا افسانہ افسانے کی معنویت سے کچھ زیادہ منسلک نہیں ہے یعنی یہ کہ اس افسانے کی معنویت کے جاننے یا نہ جاننے سے اس کے تخلیقی

لطف کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ ان کا افسانہ پڑھتے ہیں اور لطف اندوہوتے ہیں چاہے آپ اس کے معنی سمجھیں یا نہ سمجھیں۔

نیّر مسعود کا یہ افسانہ ان کے آخری افسانوی مجموعے گنجفہ میں شامل ہے۔ افسانے کا مرکزہ 'پاک ناموں والا پتھر' ہے جس پر افسانے کا عنوان تجویز کیا گیا ہے۔ اس خاندانی نشان کا ذکر ان کے پہلے مجموعے کے پہلے ہی افسانے میں ملتا ہے۔ وہاں یہ سرسری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو خیال پہلے افسانے میں سرسری تھا، بعد میں اس نے واضح شکل اختیار کی اور افسانے بلکہ دو افسانوں میں ڈھل گیا اور نہ صرف یہ کہ وہ افسانہ بن گیا بلکہ اس نے ان کے پہلے مجموعے کو ان کے آخری مجموعے سے مربوط کر دیا۔ اوجھل میں اس کا تذکرہ بس اتنا ہے:

> ''میری روانگی سے کئی دن پہلے جب میرے گلے میں پاک ناموں والا وہ پتھر ڈالا گیا جو ہمارے خاندان میں کئی پشتوں سے چلا آ رہا تھا تو میری بیزاری اور بڑھ گئی اور میں نے چپکے سے اس پتھر کو اتار کر پرانے کپڑوں کے اسی صندوق میں واپس رکھ دیا جس میں وہ ہمیشہ رکھا جاتا تھا۔''(۱)

یوں محسوس ہوتا ہے کہ 'پاک ناموں والے پتھر' کا پہلا خیال ان کے دل میں 'امام ضامن' سے آیا جو ہماری تہذیب میں سفر پر جانے والے کے بازو پر برکت اور حفاظت کی غرض سے باندھا جاتا تھا۔ اس نشان کو مرکز بنا کر پہلا مکمل افسانہ ان کے تیسرے مجموعے 'عطر کافور' میں 'وقفہ' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس افسانے کے ابتدائی تمہیدی یا تعارفی اقتباس میں اس نشان کی مرکزیت کو نمایاں کیا گیا ہے:

> ''یہ نشان ہمارے خاندان میں پشتوں سے ہے بلکہ جہاں سے ہمارے خاندان کی تاریخ کا سراغ ملنا شروع ہوتا ہے، وہیں سے اس کا ہمارے خاندان میں ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح اس کی تاریخ ہمارے خاندان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔''(۲)

اس افسانے میں بھی اس نشان کا تذکرہ کم ہے لیکن افسانے کی کلّی معنویت میں اسے اہمیت حاصل ہے مثلاً وہ باپ کو باپ اسی گفتگو کی وجہ سے سمجھنا شروع کرتا ہے جو وہ بستر مرگ پر اس نشان کے حوالے سے کرتا ہے۔ اس افسانے کے سارے کردار وہی ہیں جو 'پاک ناموں والا پتھر' میں شامل ہیں۔

وہاں صرف ایک نیا کردار ہے، 'شریک' جو استاد کا بیٹا ہے۔ یہ کردار بھی نیا ہونے کے باوجود پہلے کرداروں اور کہانی سے مربوط ہے:

''اس میں کہیں وہ بھی ہے، اس نے کہا، میں نے اسے تلاش نہیں کیا؛ تم ڈھونڈ لینا پھر وہ کچھ رک کر بولا، وہ کتابوں میں بھی ہوگا... اسے الگ مت کرنا، وہ ہمارا نشان ہے.. اس کی خاطر خون بہا ہے۔''(۳)

''پاک ناموں والا پتھر''میں اس نشان کو افسانے میں اور بھی مرکزیت حاصل ہے۔ یہاں بھی وہ افسانے کے ابتدائی تمہیدی یا تعارفی اقتباس میں اس نشان کا تعارف کراتے ہیں۔ اس اقتباس میں بھی ایک پراسراریت ہے کہ پتا نہیں چلتا کہ وہ نشان کیا ہے اور کہاں ہے۔ بس اتنا معلوم ہے کہ یہ خاندانی نشانی ہے، بہت اہم ہے اور گھر میں کہیں موجود ہے۔ مرکزی کردار کا والد اسے اس لیے بھی تلاش نہیں کرسکا کہ وہ اَن پڑھ ہے اور اس کا تذکرہ گھر میں موجود کتابوں میں ہے:

''پاک ناموں والا پتھر بیضوی قطع کی ایک سفیدی مائل لوح کی شکل میں ہے جس پر باریک حرفوں میں پاک نام کندہ ہیں۔ ایک نظر دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ کبھی اس کا رنگ خالص سفید رہا ہوگا لیکن اب یہ بتانا ممکن نہیں کہ اس میں اور کس رنگ یا کن کن رنگوں کی آمیزش ہو چکی ہے۔ پتھر نیم شفاف ہے اور روشنی کے رخ کر کے دیکھنے سے اس پر کھدے ہوئے پاک نام صاف پڑھنے میں آتے ہیں۔ اِس میں سے اُس پار کی چیزیں بھی دھندلی دھندلی دکھائی دیتی ہیں، البتہ ان کی جسامت میں فرق آ جاتا ہے اور پتھر کے رخ میں ہلکی سے تبدیلی کرنے کے ساتھ چیزوں کی جسامت بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس طرح دیکھنے سے اس پار کی چیزوں پر پاک نام لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

یہ ہمارے خاندان کا نشان ہے لیکن کئی پشتوں سے غائب تھا۔ میرے اَن پڑھ باپ کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ہمارے خاندان کا کوئی نشان ہے جو اب بھی گھر میں کہیں موجود ہے۔''(۴)

افسانے کا بنیادی موضوع اس نشان کی تلاش اور ضمنی موضوع نوادرات کی اہمیت پر قائم ہے۔ اس نشان کی تلاش خزانے کی تلاش والی کہانیوں کی طرح پُرتجسس اور دل چسپ ہے۔ مرکزی کردار ایک ایک کر کے گھر کی تمام مقفل کوٹھریوں میں رکھے سامان میں اسے تلاش کرتا ہے۔ وہ گھر میں موجود کتابوں میں بھی اس کا سراغ لگانے کی سعی کرتا ہے اور آخر کار جان لیتا ہے کہ یہ نشان پاک نام کھدے ہوئے ایک پتھر کی صورت ہے۔ وہ اسے آخری کوٹھری کے آخری صندوق میں ڈھونڈ لیتا ہے۔ یہ تلاش کسی طلسم کشا کے لوحِ طلسم تلاش کرنے سے بھی مشابہت رکھتی ہے۔ جب وہ اس نشان کو حاصل کر لیتا ہے تو اسے بہت مایوسی ہوتی ہے کیوں کہ یہ ایک عام سا پتھر نکلتا ہے جو عموماً برکت کے لیے گلے میں تعویذ کی طرح لٹکایا جاتا ہے۔ وہ اس کی اہمیت سے ناواقف رہتا ہے اور طاہرہ بی بی کے مشورے سے پھر سے کتابوں میں اس کی اصلیت کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ پھر سے ان کتابوں کو پڑھتا ہے اور اپنی جستجو کا خلاصہ تحریر کرتا ہے:

> ''سب کچھ بہت صاف تھا۔ ہر موت اور ہر خون کے ساتھ یہ ضرور بتایا جاتا تھا کہ پتھر مرنے والے کے پاس نہیں تھا۔ کئی لوگوں نے مرض کی شدّت میں اسے گلے سے اتار دیا تھا۔ کئی کے گلے سے اتار کر انھیں ہلاک کر دیا گیا۔ بعض نے غسل کرتے وقت اسے اتار دیا تھا اور غسل کرنے میں ہی ختم ہو گئے۔ کئی بیماروں کو جب ان کی حالت مایوسی کی ہوگئی، پتھر پہنا دیا گیا اور وہ اچھے ہو گئے تھے۔ پتھر ہمارے خاندان کا نشان تو تھا ہی، مجھے محسوس ہوا کہ خاندان کا سب سے بڑا مسئلہ بھی تھا، اس لیے کہ وہ جب تک کسی کے گلے میں رہتا، اسے موت نہ آتی۔ اس لیے سب اس کے طلب گار تھے اور اسی لیے اس کی خاطر خون بہتا تھا۔''(۵)

یہاں تک آتے آتے اس نشان اور افسانے کی علامتی حیثیت واضح ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگار نے اس کی دو خصوصیات بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ پتھر جس شخص کے گلے میں رہتا، اسے موت نہ آتی اور دوسری یہ کہ اس کی خاطر بہت خون بہا۔ یہ دونوں خصوصیات اسی ثنویت کو پیش کرتی ہیں جس پر پوری

کائنات قائم ہے یعنی کفر و ایمان، حق و باطل، پست و بلند، شب و روز، مثبت و منفی وغیرہ۔ ایک ہی شے ہے جو جان لیوا بھی ہے اور جان آفریں بھی۔ پہلی خصوصیت میں یہ انسان کی آرزوے لافانیت کی علامت ہے۔ پرانے مذہبی قصوں اور داستانوں میں سیکڑوں اور ہزاروں سالوں کی زندگی پانے والے کرداروں سے لے کر آبِ حیات کی جستجو والی کہانیوں تک، تمام کہانیاں انسان کی اس تمنائے ثبات کو ظاہر کرتی ہیں۔ انسان کے تمام اعلیٰ علمی و تخلیقی کارنامے بھی حیات ابدی کے حصول کی اسی خواہش کے آئینہ دار ہیں کہ اعلیٰ کارناموں سے انسان لافانیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس افسانے میں پاک ناموں والا پتھر فی الاصل انسان کی اسی ازلی خواہش کی نمایندگی کرتا ہے۔ یوں ایک پرانے پلاٹ پر استوار ہونے کے باوجود اپنے بیان کے نئے پن سے یہ کہانی بالکل نئی لگتی ہے۔

اس افسانے 'پاک ناموں والا پتھر' میں پاک ناموں والا پتھر ایسی تمام اشیا کی علامت بھی ہے جن کے حصول کے لیے انسان خون بہاتا ہے اور دوسرے انسانوں کا قتل کرتا ہے۔ پرانی کہانیوں میں ایسی ہی ایک اور علامت پارس پتھر ہے جسے عام دھات سے چھو دیا جائے تو وہ سونا بن جاتی ہے۔ یہ ان زمینوں کی علامت بھی ہے جن کے لیے انسان جنگیں لڑتا ہے۔ آج تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنے کے لیے کروڑوں کو قتل کیا گیا ہے، یہ پاک ناموں والا پتھر ان ذخائر کی علامت بھی ہے۔ یہ ہر اس چیز کی علامت ہے جس کے لیے انسان کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ اس افسانے کے آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ اس خاندانی نشانی کو دفن کر دینا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے خون بہتا ہے۔ خاندانی نشانی کہہ کر دراصل انھوں نے ایک سطح پر بنی نوع انسان کو بھی خاندان کہا ہے جو ادنیٰ سطح سے لے کر اعلیٰ ترین سطح پر کسی ایسی شے کے حصول کے لیے سرگرداں رہتا ہے اور خون بہاتا ہے۔ اس افسانے کا اصل موضوع تو انسان کی خون بہانے سے رغبت کی مذمت ہے۔ نیّر مسعود پاک ناموں والے پتھر کی طرح ہر اس شے کو دفن کر دینا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان دوسرے انسانوں کو قتل کرے لیکن نیّر مسعود کے افسانوں میں اتنی بڑی معنویت کے باوجود بھی یہ معنویت افسانے کے تخلیقی حسن میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرتی۔ اس جیسی دیگر متعدد معنویتوں کو ان کے افسانوں سے دریافت کیا جا سکتا ہے لیکن اگر ایسی معنویتیں نہ بھی دریافت ہوں تب بھی ان کا افسانہ اتنا ہی پر لطف رہتا ہے جتنا جاننے کے بعد رہتا ہے۔ یہ ایک مختلف قسم کا تخلیقی تجربہ ہے جو معنی سے زیادہ بیان کے کمال پر استوار ہے۔

نیّر مسعود کے افسانوں میں تجسس، اَسرار اور تحیّر کی نشان دہی ان کے بیشتر نقادوں نے کی ہے۔ قاضی افضال حسین نے اسے حقیقت اور واہمے کا امتزاج کہا ہے جہاں موجود کو نا موجود اور نا موجود کو موجود کیا جا سکتا ہے۔ ان کے افسانوں کو بار بار پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سارا تجسس، اَسرار یا تحیّر ان کے بیان سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ عموماً اپنے افسانوں میں کسی نہ کسی گھر، مکان، حویلی، فضا یا ماحول کو بیان کرتے ہیں۔ اس ماحول کو پڑھتے ہوئے لاشعوری طور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ یہ ماحول شناسا ہونے کے باوجود شناسا نہیں ہے، کچھ اس لیے بھی کہ بہت غور کرنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ اس کا تعلق ہمارے زمانے سے نہیں ہے بلکہ کسی قدیم عہد سے ہے مثلاً کہیں صحن میں کنواں ہوگا یا اتنی بھول بھلیاں کوٹھریاں اور دالان در دالان منظر ہوگا جو ہمارے مشاہدے میں نہیں ہے۔ پھر ان کا بیان بھی ایسا دھندلا دھندلا اور خوابناک سا ہوتا ہے کہ پورا منظر کھلتا نہیں ہے۔ کہیں سے کوئی حصہ نمایاں ہوتا ہے، کہیں سے کوئی حصہ۔ اس ماحول کو بیان کرنے کے لیے وہ ایسی زبان اختیار کرتے ہیں جو ہمارے تجربے میں نہیں رہی۔ ان کے اس افسانے 'پاک ناموں والا پتھر' کے مختلف حصوں سے اس نوع کے بیانات دیکھیے جو افسانے کے پہلے دو صفحوں سے لیے گئے ہیں:

_ ''بیرونی حصے، مکان میں داخلے کی ڈیوڑھی کے دونوں طرف بنے ہوئے حجروں کی شکل میں تھے۔ داہنے بائیں چھے چھے خاصے کشادہ حجرے تھے جن میں دروازے نہیں تھے۔

_ زنگ آلود کنجیوں سے زنگ آلود قفلوں کے کھولنے میں مجھ کو دقت ہوئی۔ کوئی کوئی کنجی تو زنگ ہی کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور مجھے اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر اسے گھمانے کے لیے زور لگاؤں گا تو وہ ٹوٹ کر قفل میں پھنسی رہ جائے گی لیکن آخرکار کسی طرح سب دروازوں کے قفل کھل گئے۔ ان کے پیچھے کوٹھریاں، کمرے اور چھوٹے چھوٹے گودام تھے جن میں پرانا سامان کباڑ کی طرح بھرا ہوا تھا۔

_ ریشمی کپڑوں میں ملبوسات بھی تھے جن کو دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ مختلف زمانوں کے لباس ہیں

_ ساری کنجیاں قفلوں میں لگ چکی تھیں لیکن جب میں گرد میں اٹا ہوا دالان میں آیا تو میں نے دیکھا کہ میرے پاس ایک کنجی ابھی باقی ہے۔

_ میں نے ایک بار سب دروازے دیکھے۔ دہرے دالان کی اندرونی دیواروں کے دروازے جو ہمیشہ کھلے رہتے تھے، ان میں سے ایک بند تھا اور اس میں موٹے کنڈے کا ایک بڑا قفل لٹک رہا تھا''۔(۶)

ان کے اس طرح کے بیانات میں ایک طرح کی ناسٹلجیائی کیفیت محسوس ہوتی ہے جو قاری پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور اسے انجان زمانوں کے انجان ماحول میں لے جاتی ہے۔ یہ محض تجسس، تحیّر یا اَسراری نہیں ہے بلکہ اس انجان اور گزرے ہوئے میں داخل ہونے کا لطف بھی ہے۔ اس کی وجہ سے افسانے کا ماحول کچھ ایسا دل ربا ہو جاتا ہے کہ قاری اس ماحول سے باہر ہی نہیں آنا چاہتا، کچھ اس وجہ سے بھی کہ افسانے کے باہر کا ماحول ہر طرح کی آلودگی اور میکانکیت کا حامل ہے اور قاری اس ماحول سے سخت بے زار ہے اور نکلنا چاہتا ہے۔ سرمایہ داری نظام جس صنعتی معاشرت سے پیدا ہوا ہے اور اس نے جس صارفی معاشرے کو پیدا کیا ہے، وہ غیر تخلیقی اور غیر انسانی ہے اور انسانی باطن میں اس سے گریز کی آرزو ہر وقت موج زن رہتی ہے اور وہ کسی ایسے ماحول میں رہنا چاہتا ہے جو تخلیقی اور انسانی ہو۔ نیّر مسعود کے افسانوں کے ماحول میں ایک طرح خواب ناکی محسوس ہوتی ہے۔ پھر یہ ماحول موجود کی بدصورت اور ان چاہی دنیا سے مختلف ہے اور قاری دم بھر کو اس ماحول میں رہ کر عافیت محسوس کرتا ہے۔

نیّر مسعود کے اسلوبِ بیان کی ایک اہم خصوصیت عدم تکمیلیت ہے۔ وہ اپنی زبان سے عدم تعین اور بے یقینی کی فضا تخلیق کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی خوابناکی اور دھندلا پن کچھ اس بیان سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ ان کے ہر افسانے سے ایسے متعدد جملے یا جملوں کے اجزا منتخب کیے جا سکتے ہیں جو ان کے اندازِ تحریر کی اس خصوصیت کو پیش کرتے ہیں۔ اس طرح کے بیانات سے ایک ادھورے پن کا احساس اور تجسس و جستجو کی آرزو قاری کے دل میں بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ بھی اس شئے کو جاننا چاہتا ہے جس کے وجود کا تعین نہیں ہو سکا لیکن جسے تلاش کیا جا رہا ہے۔ یہ نا موجودی کی نہیں بلکہ نامعلوم کی جستجو بھی ہے۔ یہ ساری گفتگو بھی مبہم یا شاید بے معنی ہو جائے اگر ہم نیّر مسعود کے افسانوں سے ایسی مثالیں تلاش نہ کریں۔ ذیل میں اس افسانے سے ایسے جملے درج ہیں جن سے ان کی اس خصوصیت کا بہ خوبی ادراک ہو سکے۔

- اس رات سونے سے پہلے میں دیر تک اپنے باپ کو یاد کرتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کی صورت مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آ رہی ہے۔
- مجھے اس چیز کا خیال آیا جو میرے خاندان کا نشان تھی۔ میرے باپ نے مجھ سے اسے تلاش کرنے کو کہا تھا لیکن یہ نہیں بتا سکا تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔

- میں نے اپنے شہر کے بارے میں بہت پڑھا اور بہت غور سے پڑھا۔ میرے اسلاف کا کہیں کسی بھی سلسلے میں ذکر نہیں تھا۔
- جائے داد کی تقسیم کے ایک تنازعے میں مجھے شبہ ہوا کہ اس پتھر کا ذکر آیا ہے۔
- اس کا نام نہیں لکھا جاتا تھا بلکہ اشاروں کنایوں میں اس کا ذکر ہوتا تھا۔
- میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہمارے خاندان کا نشان کیوں ہے۔
- میرا خیال ہے کہ یاد ہے مگر یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔
- اکیلے تو شاید نہ دیکھ سکتا
- کچھ بیان مبہم اشاروں میں تھے... مجھے محسوس ہوا، پاک ناموں والے پتھر کا ذکر بھی آتا ہے لیکن اس وقت لکھنے والوں کا بیان اور بھی مبہم ہو جاتا تھا۔
- میں شریک کے ہونٹ ہلتے دیکھ رہا تھا لیکن مجھے سنائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔
- مجھے یاد نہیں آیا کہ اس کے بعد میں نے اسے کیا کہا۔
- مگر وہ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا۔(۷)

یہ سارے اظہارات ان کے پورے افسانے میں بکھرے ہوئے ہیں لیکن دیگر جملوں سے مل کر وہ ایک ایسی کلی فضا بناتے ہیں جس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا اور ایک ایسا منظر ترتیب دیتے ہیں جو ٹھوس حالت میں نظر نہیں آتا بلکہ سیال کی طرح اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ اس سے افسانے کی مکمل فضا میں ایک بے یقینی اور عدم تعین کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اردو ادب میں گذشتہ تقریباً سو سال میں عقلیت پرستی کا جو رجحان پیدا ہوا ہے اور اس نے جس طرح کا قاری پیدا کیا ہے، اس کے لیے یہ 'لگ بھگ'، 'تقریباً' اور 'غیر متعین' دنیا اجنبی ہے اور اسی وجہ سے حیران کن ہے۔ وہ حیرانی کے عالم میں افسانے کی فضا میں داخل ہوتا ہے، تجسس کا شکار رہتا ہے اور ایسی کہانیوں کا خوگر نہ ہونے کی وجہ سے بے معنویت یا لایعنیت میں سے کسی ایک کا شکار ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ نیّر مسعود کے افسانے سمجھ نہیں آتے، اپنا ابلاغ نہیں کرتے یا بے معنی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی تاثر دیتا ہے کہ ان کا مطالعہ بہت پر لطف تھا۔

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ادب کا سارا کا سارا سروکار اسی لطف سے ہے۔ اس لطف کے بغیر وہ غیر ادب ہے۔ تخلیق کی اوّلیں غایت اسی لطف کی جستجو ہے کیوں کہ فن پارے میں انسان کے باطن کو تبدیل کر دینے کی جو طلسمی خصوصیت پائی جاتی ہے، وہ اسی لطف سے پیدا ہوتی ہے۔ نیّر مسعود کا سنجیدہ قاری ان کے افسانوں کے معانی کے لیے کچھ زیادہ کاوش نہیں کرتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ معانی جس الہامی سطح پر تخلیق ہوتے ہیں، اسی الہامی سطح پر اپنا ابلاغ بھی کرتے ہیں۔ ہم صرف انھی فن پاروں کے معانی کی جستجو کرتے ہیں جو تفہیم نہ ہونے کے باوجود قاری کے باطن سے ہم کلام ہوتے ہیں اور اسے تخلیقی لطف و لذت سے سرشار کرتے ہیں۔ اعلیٰ فن پارے اپنے معانی کا ابلاغ دو چار قرأتوں میں کرتے بھی نہیں ہیں۔ جس فن پارے کا ابلاغ پہلی قرأت میں ہی ہو جاتا ہے، اس کی ساری کشش اور اسرار ختم ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ فن پارے مختلف زمانوں میں اپنے مختلف مفاہیم تک رسائی دیتے ہیں اور وہ بھی اس صورت میں کہ جب ان کے مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے اور اس کے لیے مطلوبہ مشقت اختیار کی جائے۔ نیّر مسعود اپنے قاری سے صرف ایک ہی توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کے افسانے دنیاوی علائق سے کٹ کر پڑھے اور خود کو ان کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے آزاد چھوڑ دے۔

☆☆☆☆☆

## حواشی

(۱) نیر مسعود، سیمیا، لاہور، قوسین، ۱۹۸۷ء، ص:۲۰-۱۹

(۲) نیر مسعود، عطرِ کافور، کراچی، آج کتب خانہ، دوسری اشاعت، ۱۹۹۹ء، ص:۸۹

(۳) ایضاً ، ص:۱۰۲

(۴) نیر مسعود، گنجفہ، کراچی، شہرزاد، ۲۰۰۸ء، ص:۱۲۲

(۵) ایضاً ، ص:۱۳۹-۱۳۸

(۶) ایضاً ، ص:۱۲۳-۱۲۴

(۷) ایضاً ، ص:۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۳۸، ۱۴۰